علامہ اقبال اور تالّہِ زمان

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری اجمل خاں طبیہ کالج علیگڑھ

اسلام کی چہاردہ صد سالہ فکری تاریخ میں سوائے فرقہ حرنانیہ کے (جس کے موقف کی تجدید تیسری صدی ہجری میں مشہور فلسفی طبیب ابوبکر محمد بن زکریا الرازی نے کی تھی) اور کوئی "تالہ زمان" (Apotheosis of Time) کا قائل نظر نہیں آتا اور فرقہ حرنانیہ اسلام کے "ہفتاد و دو ملت" میں سے نہیں تھا۔ مگر چودھویں صدی میں اس انداز فکر کی علمبرداری علامہ اقبال نے اپنے ذمہ لی اور اپنی تمام ذہنی و فکری صلاحیتیں اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔

اقبال فطرتاً "مردِ مومن" تھے۔ وہ ایک دیندار خاندان میں پیدا ہوئے اور بڑے دین پسندانہ ماحول میں پرورش پائی خدا پرستی بچپن ہی سے اُن کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور اسی فطری اسلام پسندی نے عہد طفلی میں ان سے کہلوایا تھا:-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جبیں پہ تھے عرقِ انفعال کے

اسی جذبے نے یورپ کے لادینی ماحول سے بیزار کر کے اُن سے کہلوایا تھا:-

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز بعد مدت کے ترے دیوانوں کو آیا ہے ہوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اور اسی ایمان محکم پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا:-

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست وگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی بھر اعلاء کلمۃ اسلام کے لئے کوشاں رہے اور تاریخ کا یہ

عظیم المجوبہ ہے کہ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے انھوں نے "تالزمان" کا سہارا لیا۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی مگر یہاں اجمالاً اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ علامہ نے اس عقیدے کا ابتدائی تصوّر برگسان کے "دوران خالص" (Duree Reele) سے لیا تھا مگر اس کی تکمیل الیگزنڈر کی کتاب "Space, Time and Deity" سے پڑھ کر کی اور جو کسر رہ گئی تھی اس کی تلافی اشپنگلر کی "انحلال المغرب" (Decline of the West) کے ذریعہ ایرانی زروانیت سے واقفیت حاصل کر کے کی۔

ان پے بہ پے فکری تاثرات کے نتیجے میں انجام کار آن کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ زمانہ ہی "حقیقت مطلقہ" یا "Ultimate Reality" ہے یا سیدھے سادے لفظوں میں "زمانہ ہی خدا ہے" (نعوذ باللہ منھا) اور یہ وہ خیال ہے جہاں تک برگسان بھی اپنی فلسفیانہ آزادی رائے کے باوجود [جس کے لئے وہ فرانس کے مذہبی حلقوں میں الحاد و بیدینی کے ساتھ متہم تھا] پہونچنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مگر علامہ کی مطلق العنان تخیل انھیں یہاں تک لے پہونچی۔ یہی نہیں بلکہ اسی جرأت رندانہ کا فقدان اُن کی نظر میں برگسان کی سب سے بڑی کوتاہی تھا جیسا کہ وہ "خطبات" میں فرماتے ہیں:۔

> "میں یہ خیال کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ برگسان کی غلطی زمان خالص کو ذات پر مقدم سمجھنے میں مضمر ہے کیونکہ صرف ذات ہی کے ساتھ دوران خالص محمول بنایا جا سکتا ہے۔"

بہرحال وہ (۲۸-۱۹۲۹ء) کے دوران میں زمانہ کے "حقیقت مطلقہ" ہونے کے بڑی شدت سے قائل ہو چکے تھے چناں چہ "خطبات" (الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید) میں فرماتے ہیں۔

> "جس طرح ہم اپنی ذات میں زمان کے تعاقب و تسلسل کا ادراک کرتے ہیں، اس کی تنقیدی توجیہ اس بات کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ حقیقت مطلقہ کو دوران خالص تصور کریں جس کے اندر علم حیات اور ارادہ (فکر حیات اور مقصد) ایک دوسرے

کے ساتھ گھل مل کر ایک منظم وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اس وحدت کا تصور ہم صرف اسی حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ذات کی وحدت ہے ـــــ ایک برہمہ محیط قائم بذاتہ ذات ـــــ جو تمام انفرادی (جزئی) افکار اور حیات کا سرچشمہ ہے۔

بایں ہمہ ان کی دیرینہ اسلام پسندی اس خیال میں مانع تھی۔ لہٰذا موجودہ عیسوی صدی کے تیسرے عشرہ میں انھیں اس بات کی تلاش ہوئی کہ اس نئے تصور کے لئے اسلامی فکر میں کہیں سند مل جائے۔ بدقسمتی سے چند کوتاہ فکر احباب نے علامہ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی اور انھیں بتایا کہ زمانہ کا یہ تصور نہ صرف عربی مدارس میں زیر درس معقولات ہی کی اعلیٰ کتابوں میں موجود ہے بلکہ حدیث کی کتابوں میں بھی ہے جو ایک مرد مومن کے لئے واجب الایمان ہیں۔ مگر علامہ سید سلیمان ندوی رح کے اس درجہ عقیدت مند تھے کہ ان سے اس نئے خیال کی تصویب کرائے بغیر اپنانا نہیں چاہتے تھے۔ ادھر سید صاحب نے جو اس سنگلاخ وادی کے کبھی رہرو نہیں رہے تھے، عافیت خاموشی ہی میں سمجھی۔ مگر علامہ نے اس خاموشی کو "تصویب" سمجھ لیا اور پھر جو اس فکری بے راہ روی کے قلزم ناپیدا کنار میں غوطہ لگایا تو آخر تک اسی گرداب میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے اور ساحل نجات تک رسائی آخر تک ممکن نہ ہو سکی۔

بہرکیف علامہ نے مکتوب گرامی مورخہ ۔ مارچ ۱۹۲۶ء کو لکھا تھا۔

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لاتسبوا الدھر الخ۔ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں سے ملے گی"

آج اس خط کو لکھے ہوئے ۴۴ سال اور شائع ہوئے کوئی ۲۹ سال ہو رہے ہیں اور شائع بھی ہوا تو سید صاحب کی زیر ادارت۔ مگر نہ تو انہوں نے اس مسئلہ کے حل کرنے کی

کوشش کی، اور نہ بعد میں کسی اور شارح یا نقاد نے اس کی تحقیق کی زحمت فرمائی۔ عرف سید صاحب نے "اقبالنامہ" کے اندر اس خط پر یہ نوٹ دیا ہے :۔

" اقبال مرحوم کو اس بحث سے بڑی دلچسپی تھی۔ میں نے اس پر لاہور میں انکی ایک تقریر بھی سنی تھی، اخیر زمانے میں میرے دل میں علامہ ابن قیم کی تصانیف سے ایک حقیقت فہم میں آئی جس سے بڑی خوشی ہوئی۔ مگر افسوس کہ اس زمانے میں مرحوم بیمار تھے۔ انتظار تھا کہ وہ تندرست ہوں تو ان کو سناؤں۔ مگر افسوس ع

جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

مجھے یقین ہے کہ وہ اگر اس کو سنتے تو ضرور خوش ہوتے "

معلوم نہیں سید صاحب نے علامہ کے مکتوب مورخہ ۷۔ مارچ ۱۹۲۸ء کا کیا جواب دیا۔ لیکن انہوں نے "اقبالنامہ" میں جو نوٹ دیا ہے، اس سے نفس سوال کے جواب پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ یہ تو "اقبالیات" کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ فلسفۂ خودی کے علاوہ علامہ کو مسئلہ زمان، بالخصوص "دوران خالص" سے بے حد دلچسپی تھی۔ مگر وہ تقریر کیا تھی جو سید صاحب نے لاہور میں اس موضوع پر علامہ کی زبان سے سنی تھی۔ ہم بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ سید صاحب کم از کم اس کے خط و خال سے قارئین کو ضرور واقف کر دیتے۔ رہا ان کا اپنا موقف جو انھوں نے ابن قیم جوزی کی تصانیف کے مطالعے کے نتیجے میں اختیار کیا تھا، کاش وہ اسے ہی نقل کر دیتے تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ ابن قیم کی توجیہ اُن توجیہات سے مختلف تھی جو عامہ متکلمین و فلاسفہ نے بیان کی ہیں، یا نہیں۔

صاحب "شمس بازغہ" (ملا محمود جونپوری) اور صاحب "صدرا" (صدرالدین شیرازی) کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری ہے، مگر "تاۂ زمان" کا قدیم ترین حوالہ اسلامی فکر میں سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ملتا ہے اور اس کا قائل تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی تفصیل تو آئندہ آئے گی۔ سر دست تو علامہ کو جو کچھ بتایا گیا تھا اور جس کی وضاحت انہوں نے سید

سلیمان ندوی سے چاہی تھی۔ اس کی توضیح کی جا رہی ہے۔

مسئلۂ زمان کی توجیہ ایک جانب حکماء (فلاسفہ) نے کی ہے اور دوسری جانب حضرات متکلمین نے۔ مگر مسئلہ زیر بحث میں زیادہ اہم فلاسفہ کی توجیہ ہے۔

عام طور پر فلاسفہ (بالخصوص شیخ بوعلی سینا کے زمانہ سے) زمانہ کے باب میں اسی مذہب کے پیرو رہے ہیں جو ارسطو نے اپنایا تھا۔ اس مذہب کو قاضی عضد نے "المواقف فی الکلام" میں بدیں طور نقل کیا ہے۔

"د الرابعا ماذهب الیه ارسطو انه مقدار حرکة الفلك الاعظم"

(زمانہ کے باب میں مذاہب پنجگانہ میں سے) چوتھا مذہب وہ ہے جو ارسطو نے اختیار کیا تھا اور جس کی رو سے زمانہ فلک اعظم کی حرکت کی مقدار کا نام ہے)

بہرحال شیخ بوعلی سینا نے زمانہ کے اس ارسطالیسی تصور کو "کتاب النجاۃ" اس طرح واضح کیا ہے۔

"الزمان مقدار للحرکة المستدیرة من جهة التقدم والتاخر لا من جهة المسافة"

(زمان حرکت مستدیرہ کی مقدار کا نام ہے تقدم و تاخر کی جہت کے لحاظ سے نہ کے بلحاظ مسافت کے) مگر زیادہ مروج اثیر الدین ابہری کی تعبیر ہے:۔

"الزمان مقدار الحرکة"

(زمانہ مقدار حرکت کا نام ہے)

کیونکہ اثیر الدین ابہری کی ہدایۃ الحکمۃ ہی عام طور پر مدارس میں فلسفیانہ تفکیر کی اساس رہی ہے۔ بعد کے متعدد علماء نے اس پر شروح لکھیں جن میں سے قبول عام دو شرحوں کو حاصل ہوا۔ ان میں سے پہلی تو محقق دوانی کے شاگرد میبذی نے لکھی تھی اور دوسری میر باقر داماد کے شاگرد صدر الدین شیرازی (ملا صدرا) نے اور اسی لئے یہ دونوں کتابیں اپنے اپنے مصنف کے نام پر "میبذی" اور "صدرا" کہلاتی ہیں۔

ملا محمود جونپوری نے فلسفہ میں ایک مستقل کتاب "شمس بازغہ" کے نام سے لکھی جو کچھ دن پہلے تک عربی مدارس کے اندر فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں مشمول تھی۔ یہ کتاب متن اور شرح کے مجموعہ کا نام ہے جو دونوں ملا محمود کی تصنیف ہیں۔ متن کا نام "الحکمۃ البالغۃ" اور شرح کا نام شمس بازغہ ہے۔ بدایۃ الحکمۃ" تین قسموں پر مشتمل ہے۔ القسم الاول منطق میں، القسم الثانی طبیعیات میں اور القسم الثالث الٰہیات میں۔ ان میں سے قسم اول (حصہ منطق) کا درس میں رواج نہیں ہے۔ قسم ثانی (حصہ طبیعیات) تین فنون پر مشتمل ہے:۔ الفن الاول ما یعم الاجسام کی بحث میں، الفن الثانی فلکیات کی ابحاث میں اور الفن الثالث عنصریات کی ابحاث میں۔

صدرا (جو صدرالدین شیرازی کی "شرح ہدایۃ الحکمۃ" کا نام ہے) کا وہ حصہ جو درس میں متداول ہے، طبیعیات کے پہلے فن "ما یعم الاجسام" کی شرح پر مشتمل ہے۔ اس فن میں دس فصلیں ہیں جن میں سے آخری فصل "زمان" پر ہے۔ شارح (صدرائے شیرازی) نے اس فصل کو تین مطالب پر منقسم کیا ہے (۱) زمان کی اِنّیت (۲) زمان کی ماہیت اور (۳) زمان کا مبدع (غیر مقطوع (البدایہ والنہایہ) ہونا لیکن انہوں نے ان مطالب ثلاثہ سے پہلے زمانہ کے باب میں مختلف مفکرین کے مذاہب گنائے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"وقبل الخوض فی المطالب ینبغی ان	ان مطالب ثلاثہ میں غور و فکر کرنے سے پہلے یہ جان لینا
نعلم ان الناس اختلفوا فی الزمان اختلافاً	چاہئے کہ لوگوں نے زمانہ کے باب میں بڑا شدید اختلاف
عظیماً، فمنھم من اثبت لہ وجوداً	کیا ہے:۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے وجود عینی
عینیاً ومنھم من نفی وجودہ الا بحسب الوھم	ثابت کیا ہے اور بعض نے اس کے وجود کی نفی
والمثبتون لوجودہ: منھم من جعلہ جوھراً	کی ہے سوائے وہم میں ملحوظ ہونے کے جن لوگوں
ومن جعلہ عرضاً والجاعلون لہ جوھراً منھم	نے اس کے وجود (عینی) کو ثابت کیا ہے ان
من جعلہ جوھراً قدسیاً غیر جسمانی زمرقہ	میں سے بعض نے اسے جوہر اور بعض نے عرض
منھم زعمت انہ الواجب الوجود لذاتہ ومنھم	بتایا ہے جن لوگوں نے اسے جوہر بتایا ہے ان

من جملة جوهر جسماني هو الفلك الاعلى والجاعلون له عرضاً اتفقوا انه عرض غير قار فهو اما نفس الحركة او غيرها فهذا تفصيل المذاهب"
(صدرا مجتبائی صفحہ ۱۹۵-۱۹۶)

میں سے بعض نے اسے جوہر قدسی غیر جسمانی قرار دیا ہے اور ان میں سے ایک فرقہ نے اسے واجب الوجود لذاتہ گردانا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے جوہر جسمانی قرار دیا ہے، وہ (جوہر جسمانی) فلک اعلیٰ ہے۔ اور جن لوگوں نے اسے عرض بتایا ہے ان کا اس کے "عرض غیر قار" ہونے پر اتفاق ہے یہ (عرض غیر قار) یا تو نفس حرکت ہے یا اس کے علاوہ اور کچھ ہے یہ ہے زمانہ کے مذاہب کی تفصیل۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے ان مختلف مذاہب کی وضاحت ہو جائے گی

زمانہ
- وجود عینی رکھتا ہے
  - جوہر ہے
  - عرض ہے (عرض غیر قار)
    - جوہر غیر جسمانی ہے
      - جوہر قدسی ہے (۱)
      - واجب الوجود لذاتہ ہے (۲)
    - جوہر جسمانی ہے فلک اعلیٰ ہے (۳)
    - نفس حرکت کا نام (۴)
    - نفس حرکت کے علاوہ کسی اور شے کا نام ہے یعنی مقدار حرکت (۵)
- وجود عینی نہیں رکھتا صرف وہمی وجود رکھتا ہے۔

ان میں سے دوسرے مذہب کی علامہ کو اطلاع دی گئی تھی جب کہ انہوں نے سید صاحب کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں لکھا تھا۔

"شمس بازغہ" یا "صدرا" میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک قول یہ ہے۔

کہ زمان خدا ہے"

"شمس بازغہ" حکمت طبیعیہ ہے۔ ملا محمود اس کی تبویب و تفصیل ارسطو کے انداز پر کرنا چاہتے تھے تجویز یہ تھی کہ پہلا فن "سماع طبیعی" پر ہو جس میں دو مقالے ہیں۔ دوسرے مقالہ کا تیسرا باب مباحث حرکت پر ہے۔ انھیں مباحث میں سے "زمان" کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلہ کو اس کے متعلقات کے ساتھ مصنف علیہ الرحمۃ نے مختلف فصول میں بیان کیا ہے پہلے شیخ بوعلی سینا کے انداز میں زمان کے وجود کو ثابت کر کے مذہب مختار کے مطابق اس کی ماہیت کو متعین کیا ہے؛ پھر زمانہ کے "ابداع" پر بحث کی ہے کہ نہ اس کی بدایت ہے نہ نہایت۔ وہ حادث ضرور ہے لیکن اس معنی میں کہ اس کے "محدث" کو اس پر "تقدم بالذات" حاصل ہے نہ کہ "تقدم بالزمان"؛ اس فصل میں انہوں نے میر باقر داماد کے نظریہ "حدوث دہری" پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ ازاں بعد مسئلہ "آن" کی بحث ہے۔ اور پھر ایک مستقل فصل میں شیخ بوعلی سینا کے مذہب فی الزمان کے علاوہ زمانہ کے باب میں مفکرین اسلام جن اور مذاہب سے واقف تھے، انھیں نقل کر کے اُن پر تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"قلت فصل: کانت لہم فی الزمان قبل نضج الحکمۃ ظنون بتفریط و افراط۔ فالمفرطون فیہ منہم من نفاہ راساً..... .... واما المفرطون فمنہم من جعلہ واجباً لامتناع العدم علیہ لذاتہ، والاکان لعدمہ قبلیۃ علی وجودہ او بعدیۃ عنہ ولا یکونان الا بزمان"	میں کہتا ہوں۔ فصل:۔ فلسفہ و حکمت کے پختہ اور کمل ہونے سے پہلے مفکرین (زمانہ کے متعلق) افراط و تفریط کے ساتھ گمان کیا کرتے تھے۔ جو لوگ اس باب میں تفریط سے کام لیتے تھے وہ تو سرے سے اُس کا انکار ہی کرتے تھے اور جنھوں نے افراط سے کام لیا اُن میں سے بعض مفکرین نے اسے واجب قرار دیا کیونکہ اُس پر عدم لذاتہ ممتنع ہے، ورنہ اُس کے مقطوع البدایہ ہونے کی صورت میں،

اُس کا عدم اُس کے وجود سے متقدم ہوگا اسی طرح (اس کے مقطوع النہایہ ہونے کی صورت میں) اُس کا عدم اُس کے وجود سے متاخر ہوگا اور یہ دونوں (قبلیت و بعدیت یا تقدم و تاخر) صرف زمانی ہی ہو سکتے ہیں (اس طرح اُسے معدوم ماننے ہوئے بھی موجود ماننا پڑے گا جو تناقض بالذات قول ہے)

زمانہ کو واجب الوجود ماننے والوں کے قول کی تائید میں اسی قسم کی دلیل ملا صدرا نے دی تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"و اما حجۃ من زعم ان الزمان واجب الوجود لذاتہ فھو ان عدمہ یلزم من فرض عدمہ لذاتہ امر محال۔ وکل ما یلزم من فرض عدمہ محال فھو واجب الوجود لذاتہ اما الکبریٰ فضروریۃ و اما الصغریٰ فلانا فرضنا عدم الزمان قبل وجودہ او بعد وجودہ لکانت القبلیۃ والبعدیۃ زمانیۃ فقد لزم من فرض عدمہ فرض وجودہ فتجویز العدم علی الزمان متناقض۔"

(صدرا صفحہ ۲۰۰-۲۰۱)

اور اُن لوگوں کی دلیل، جن کا گمان ہے کہ زمانہ "واجب الوجود لذاتہ" ہے، یہ ہے کہ زمانہ کے عدم ذاتی کے فرض کرنے سے محال لازم آتا ہے اور ہر وہ چیز جس کے معدوم فرض کرنے سے محال لازم آتا ہو وہ "واجب الوجود لذاتہ" ہوتی ہے اس استدلال کا مقدمہ کبریٰ تو ضروری ہے۔ رہا مقدمہ صغریٰ تو اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ اگر ہم زمانہ کے وجود سے پہلے اُس کا عدم فرض کریں یا اُس کے وجود کے بعد اُس کا عدم فرض کریں تو "قبلیت" اور "بعدیت" زمانی ہی ہوگی اور اس طرح اُس کے معدوم فرض کرنے سے اس کا وجود لازم آئیگا۔ پس زمانہ کے معدوم ہونے کی تجویز

متناقض بالذات ہے۔

اسی طرح ملا محمود نے مذکور الصدر اجمالی دلیل کی تفصیلی شرح بدیں طور کی ہے :۔

"واما الذین افرطوا فطائفۃ جعلوہ قائماً بنفسہ فمنہم بالغ فی الغلو فجعلہ واجب الوجود..... فللذین اتخذوہ الٰہاً واجب الوجود، انما اوقعہم فی ھذہ الورطۃ الظلماء ان الزمان لو فرض معدوماً کان لعدمہ قبلیۃ علی وجودہ او بعدیۃ وھذہ الزمانیۃ فیلزم وجود الزمان علی تقدیر فرض عدمہ فکان عدمہ ممتنعاً لذاتہ وما امتنع عدمہ لذاتہ وجب وجودہ" القبلیۃ او البعدیۃ لیست

اور جن لوگوں نے زمانہ کے باب میں افراط سے کام لیا ہے، اُن میں سے ایک گروہ نے اُسے "قائم بنفسہ" بتایا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ اُسے واجب الوجود سمجھ لیا۔۔۔ پس جن لوگوں نے اُسے خدائے واجب الوجود مانا ہے انھیں اس اندھیری گرداب میں اس دلیل نے ڈالا ہے کہ اگر زمانہ کو معدوم فرض کیا جائے تو اُس کے عدم کو اُس کے وجود کے ساتھ "قبلیت" یا "بعدیت" کا تعلق ہوگا اور یہ "قبلیت" یا "بعدیت" صرف زمانی ہی ہوگی۔ پس زمانہ کے معدوم ہونے کو فرض کرنے کی تقدیر پر اس کا وجود لازم آئیگا۔ اس طرح اُس کا معدوم ہونا ممتنع بالذات ہوگا۔ اور جس کا عدم ممتنع بالذات ہوتا ہے، اس کا وجود واجب ہوتا ہے۔

لیکن "قدمِ زمان" کا مذہب اسلامی مفکرین کو کوئی ذمہ دار اور سنجیدہ قائل پیدا نہ کر سکا۔ اور اس کے ردمیں مختلف دلائل وضع کئے گئے۔ اس کی تفصیل امام رازی نے "المباحث المشرقیہ" میں دی ہے۔ بعد کے علماء میں سے ملا صدرا نے اس مذہب کے رد میں حسب ذیل دلیل دی ہے :۔

"والجواب ان استحالہ نحو خاص من العدم (قائلین قدمِ زمان کی دلیل کا) جواب یہ ہے

لذاته لا تقتضی استحالة مطلق العدم
فالواجب الوجود لذاته ما یمتنع علیه
جمیع انحاء العدم لذاته والزمان لا
یابی لذاته ان لا یوجد اصلاً وذات
ابی لذاته ان یعدم بعد کونه موجوداً "

عدم لذاتہ کے امر محال ہونے کی کوئی خاص جہت اس کے مطلقاً معدوم ہونے کی متقاضی نہیں ہوتی حالانکہ واجب الوجود لذاتہ اس ہستی سے مراد ہے جس پر عدم لذاتہ کے جملہ انحاء وجہات ممتنع الوجود ہوں۔ لیکن زمانہ لذاتہ اس بات سے تو انکار نہیں کرتا کہ وہ سرے سے پایا ہی نہ جائے ہر چند کہ وہ موجود ہونے کے بعد معدوم ہونے سے ابا کرتا ہو۔

اسی طرح ملا محمود نے اس مذہب دوامِ زمان کی رد میں لکھا ہے:

"والذی یزیح شبهتهم انه یلزم وجود
الزمان علی تقدیر فرض عدمه اذا فرض
العدم سابقاً علی الوجود ولاحقاً له اعنی
اذا فرض عدمه تارةً مع وجوده اخری۔
اما اذا فرض عدمه مطلقاً لم یلزم من فرض
ذلک وجوده۔ فالممتنع بالنظر الی ذاته
هو نحو العدم المتجاور مع الوجود لا نحو العدم
المطلق فلا یمتنع علیه مطلق العدم۔
والواجب ما یمتنع علیه مطلق العدم
لا نحو منه دون نحو "
(الشمس البازغہ صفحہ ۱۳۶)

جس بات سے ان قائلین دوام زمان کا شبہ زائل ہوگیا ہے کہ زمانہ کو معدوم فرض کرنے کی تقدیر پر اُس کا وجود اسی صورت میں لازم آتا ہے۔ جبکہ یہ عدم اس کے وجود سے سابق یا اس پر لاحق فرض کیا جائے یعنی ایک مرتبہ اس کا عدم فرض کیا جائے اور دوسری مرتبہ اس کے وجود کو فرض کیا جائے۔ لیکن جب اس کا مطلق عدم فرض کیا جائے تو اس فرض کرنے سے اس کا وجود لازم نہیں آئیگا۔ پس اُس کی ذات کے لحاظ سے جو امر ممتنع ہے وہ ایسا عدم ہے جو وجود کے ساتھ ساتھ ہو نہ کہ "عدم مطلق" پس زمانہ کے لئے مطلق عدم ممتنع نہیں ہے۔ حالانکہ واجب تو کہتے ہی اس کو ہیں جس پر مطلق عدم

ممتنع ہونا کہ عدم کی دیگر انحاء کو چھوڑ کر کوئی ایک

نحو (جہت)

اس استدلال سے اس مذہب کی "مرجوحیت" ہی نہیں بلکہ سخافت بھی متحقق ہو جاتی ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر علامہ اس کے "مالہ" کے ساتھ "ماعلیہ" سے بھی واقف ہو جاتے تو اس "تالہ زمان" کا خیال بھی دل سے نکال دیتے۔ مگر علامہ کے زمانہ میں کسی اور عالم کو ان کے اس اضطراب ذہنی کا پتہ نہ تھا اور جن کو معلوم تھا۔

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

کا مصداق تھے۔

بہرحال علامہ جس اضطراب ذہنی میں مبتلا تھے، اس سے نجات پانے کے لئے ان کی نگہ انتخاب سید صاحب پر پڑی اور یہی ان کی بنیادی کوتاہی تھی۔ انہوں نے اپنے ملکہ مردم شناسی پہ اپنے جذبۂ عقیدت مفرط کو غالب آجانے دیا۔ سید صاحب کا علم و تبحر، ان کا تاریخی مطالعہ، ان کا ادبی ذوق، ہر چیز اپنی جگہ مسلّم۔ مگر

ہر مردے و ہر کارے

آخر تو سید صاحب اسی ادارے کے نمایندے تھے جہاں سے معقولات کو سب سے پہلے دیس نکالا ملا تھا۔ مگر علامہ کی عقیدتِ مفرط نے اس نقطۂ نظر سے کبھی انتخاب کے وقت انہیں سوچنے نہیں دیا۔ پھر مسئلہ اپنی جگہ اس منفرد نوعیت کا تھا کہ اگر وہ خیرآبادی خاندان کے کسی استاد سے بھی دریافت کرتے تو شاید وہ بھی علامہ کو مطمئن نہ کر سکتا۔ اس مسئلہ کا شافی جواب تو صرف وہی علامہ روزگار مہیا کر سکتا تھا جس نے مشرق میں پہلی مرتبہ "Development of Metaphysics in Persia" لکھی۔ مگر علامہ کی بنیادی بھول یہی تھی کہ

آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

وہ کم و بیش چھ سال سید سلیمان ندوی سے استفادہ کی کوشش کرتے رہے، مگر نتیجہ

ڈھلک کے تین بات سے زیادہ نہ نکلا۔ کاش "فلسفۂ عجم" کا عبقری روزگار مصنف جو عہد اسلام کی ما بعد کی سرگرمیوں کے علاوہ ایک جانب اُن کے پیشرو یونانی اور ایرانی حکماء کی تفکیری مساعی سے اور دوسری جانب اُن کے (مسلمانوں کے) بعد آنے والے یورپی فلاسفہ کی سرگرمیوں سے اُن کے صحیح پس منظر میں واقف تھا، اگر مختلف ماخذ سے بنفسِ نفیس فکرِ انسانی کا ایک منظم جائزہ مرتب کرتا تو بنی بصیرتِ ایمانی اور خلوصِ دینی کی برکت سے اُن غیر اسلامی افکار کے طلسم میں نہ پھنستا بلکہ متنبہ کا اُسے ان علماء کی خاموشی کی وجہ سے کوئی موقعہ نہیں مل سکا۔

اس سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ حدیث "لا تسبّوا الدھر" کی اس ملحدانہ و دہریانہ تاویل کا تھا جو علامہ کو ان کے احباب نے بتائی تھی "صدرا" و "شمس بازغہ" خیر معقولات کی کتابیں ہیں، جن سے ناواقفیت کا عذر ایک حد تک قابل پذیرائی ہو سکتا ہے۔ مگر "بخاری شریف" تو حدیث کی کتاب ہے، اس کے باب میں تو کسی کوتاہی کو قابل عفو نہیں سمجھا جا سکتا۔

"حدیث" "لا تسبّوا الدھر" کے الفاظ مختلف روایات میں جو بھی رہے ہوں مگر اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ علماء تو درکنار نو آموز طلبہ بھی جانتے تھے کہ اس کے معنی ہیں :۔

"دہر (زمانہ) کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مقلب دہر (اور حوادث روزگار کا فاعل) ہے"

یہ کوئی چالیس پچاس سال پہلے تک کی بات ہے۔ لیکن جب سے علامہ اقبال کے "خطبات" شائع ہوئے ہیں، صورت حال بدلنے لگی ہے۔ انھوں نے فرمایا :۔

"This is why the Prophet said, 'Do not vili time for time is God"

(یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: زمانہ کو برا مت کہو، کیونکہ زمانہ خدا ہے)

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ہے :۔

"The probaem of t fmo has always drawn the attentdon of Mmslim thinkers and mystimes This seams te bekdco to the Propheos' idontifica ion of God sith (Time) in a well known tradihion."

(زمانہ کے مسئلہ نے ہمیشہ مسلم مفکرین و متصوفین کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی ہے۔ اس کی وجہ...... یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں زمانہ (دہر) کو عین باری قرار دیا ہے)۔

مگر یہ اس حدیث کے پس منظر، فکری ماحول اور ان سب سے زیادہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم سے جو اسلامی فکر کا اصل الاصول ہے۔ بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ پوری بحث تو ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اسالمین علمار نے ہمیشہ اس حدیث کے یہی معنی لئے ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں۔ ان میں قرآن کریم کے (درمز شناس (مفسرین) بھی تھے اور اقوالِ رسول کے محرم راز (محدثین) نیز شریعت بیضاء کے دانائے راز فقہاء بھی۔ چنانچہ امام جریر طبری نے جو طبقۂ مفسرین کے گل سرسبد ہیں آیت کریمہ

"وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ" الآیہ۔

کے شان نزول میں اس حدیث کے سلسلے میں فرمایا ہے:

" وذکر ان هذہ الآیة نزلت من اجل ان اهل الشرك كانوا یقولون الذی یهلكنا ویفنینا الدهر والزمان ثم یسبون ما یفنیهم ویهلكهم وهم یرون انهم یسبون بذلك الدهر والزمان فقال الله عز وجل لهم انا الذی افنیكم واهلككم لا الدهر والزمان ولا علم لكم بذلك "
(تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۵ صفحہ ۹۲)

قتادہ نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت کا نزول اس وجہ سے ہوا کہ مشرکین کہا کرتے تھے کہ جو ذات ہمیں ہلاک کرتی ہے وہ "دہر" اور زمانہ ہے پھر جو انھیں فنا اور ہلاک کرتا ہے اسے گالی دیتے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ دہر اور زمانے کو گالی دے رہے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ کہ میں ہی وہ ہوں جو تمہیں فنا اور ہلاک کرتا ہوں نہ کہ دہر اور زمانہ۔ اور تمہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔

امام ابن جریر طبری نے چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں وفات پائی مگر بعد کے مفسرین کا بھی یہی موقف رہا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

یہی موقف محدثین کرام کا تھا۔ کتب حدیث کے متون تو پچھلی صدیوں میں مرتب ہوئے تھے مگر ان کی شرح و تعبیر یا زبانی ہوتی تھی یا کتب تفاسیر کے ضمن میں۔ چوتھی صدی ہجری میں ہم محسوس علماء کو کتب حدیث کی شرح و اصلاح کرتے پاتے ہیں۔ ان میں ایک عظیم شخصیت امام خطابی کی ہے۔ انہوں نے ۳۸۸ھ میں وفات پائی تھی، اپنی جلالت قدر کی بنا پر وہ چوتھی صدی ہجری کے محدثین کے نمائندے سمجھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے "سنن ابی داؤد" کی شرح "معالم السنن" کے نام سے لکھی تھی۔ اس شرح میں وہ اس حدیث "لاتسبوا الدھر" کی تاویل میں فرماتے ہیں :-

"قال الشیخ: تاویل ھذا الکلام ان العرب انما کانوا یسبون الدھر علی انہ ھو الملم بھم فی المصائب والمکارہ فیضیفون الفعل فیما ینالھم منھا الیہ ثم یسبون فاعلھا، فیکون مرجع السب فی ذلک الی اللہ سبحانہ اذ ھو الفاعل لھا۔ فقیل علی ذلک لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر ای ان اللہ ھو الفاعل لھذہ الامور التی تضیفونہا الی الدھر۔

شیخ نے فرمایا ہے: اس کلام کی تفسیر یہ ہے کہ اہل عرب دہر کو گالیاں دیا کرتے تھے کہ وہی ان پر مصائب و تکالیف نازل کرتا ہے اور جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے اس کی طرف منسوب کرتے پھر اس کے فاعل کو گالی دیتے۔ اس صورت میں گالی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتی کیونکہ وہی ان مصائب و حوادث کا فاعل حقیقی ہے۔ اس پر کہا گیا کہ "لاتسبوا الدہر فان اللہ ہو الدہر" یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان امور کا فاعل ہے جنہیں (تم دہر کی طرف منسوب کرتے ہو۔)

محدثین کرام کا یہی مسلک بعد میں بھی رہا چنانچہ امام نوویؒ نے "شرح صحیح مسلم" کے اندر اس حدیث کی تاویل میں لکھا ہے :-

"وسببہ ان العرب کان شانھا ان تسب الدھر عند النوازل والحوادث والمصائب النازلۃ بھا من موت اوھرم

اور اس کا سبب یہ ہے کہ عربوں کا دستور تھا کہ وہ مصائب و حوادث کے وقت (مثلاً موت بڑھاپا یا مال کی برباد وغیرہ)

او تلف مال او غیر ذلك فیقولون
یا خیبة الدهر و نحو هذا من الفاظ
سب الدهر فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
لا تسبوا الدهر فان اللہ هو الدهر
ای لا تسبوا فاعل النوازل فانکم
اذا سببتم فاعلها وقع السب علی اللہ
تعالی لانہ هو فاعلها و منزلها»
(شرح صحیح مسلم للامام النووی المجلد الثانی صفحہ ۲۴۳)

دہر کو گالی دیتے اور کہتے "یا خیبة الدهر"
اور اسی طرح کی دوسری گالیاں۔ اسی پر جناب
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا تسبوا
الدهر فان اللہ هو الدهر" یعنی ان مصیبتوں
کے نازل کرنے والے کو گالی مت دو کیونکہ جب
تم اس کے فاعل کو گالی دوگے تو وہ گالی
اللہ تعالی پر پڑے گی کیونکہ وہی ان مصیبتوں کا
فاعل ہے اور وہی ان کا نازل کرنے والا ہے۔

بہر حال محدثین کرام کے نزدیک نہ تو اللہ دہر ہے، نہ دہر اللہ ہے اور نہ دہر یا زمانہ کو حوادث کائنات میں کوئی دخل ہے۔ امام نووی نے اس آخری بات کو بھی صاف کر دیا ہے، یعنی محدثین باوجود لفظی اختلافات کے بلا کسی استثناء کے زمانہ یا دہر کو حوادث کائنات میں غیر موثر مانتے ہیں:۔

"واما الدهر الذی هو الزمان فلا
فعل لہ بل هو مخلوق من جملة خلق
اللہ تعالی"

رہا دہر جو زمانہ ہے تو اس کا کوئی فعل نہیں ہے۔
وہ تو اللہ تعالی کی منجملہ دیگر مخلوقات کے
ایک مخلوق ہے۔

یہی نہیں بلکہ حدیث کے چوتھے متن "فان اللہ هو الدهر" میں "دہر" خبر نہیں ہے بلکہ خبر محذوف کا مضاف الیہ ہے چناں چہ امام نووی نے اس بات کو بالکل صاف کر دیا ہے:۔

"و معنی فان اللہ هو الدهر ای فاعل
النوازل والحوادث وخالق الکائنات۔"

اور "فان اللہ هو الدهر" کے معنی ہیں اللہ
تعالی ہی، مصائب و حادثات کا فاعل اور کائنات
کا خالق ہے۔

جماعت فقہاء کے نمائندے چوتھی صدی میں امام ابو بکر جصاص رازی اس باب میں قرار دیتے

جاسکتے ہیں۔ ان کی "احکام القرآن" آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ اس تفسیر کے اندر آیت کریمہ۔ "وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ" الآیۃ کی تفسیر کے ضمن میں حدیث "لاتسبوا الدہر" کی تاویل میں فرماتے ہیں:

"تاولہ اھل العلم علی ان اھل الجاھلیۃ کانوا ینسبون الحوادث المجحفۃ والبلایا النازلۃ والمصائب المتلفۃ الی الدھر فیقولون فعل الدھر وصنع بنا ویسبّون الدھر کما قد جرت عادۃ کثیر من الناس بان یقولوا اساء بنا الدھر ونحو ذلک۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تسبّوا فاعل ھذہ الامور، فان اللہ ھو فاعلھا ومحدثھا"

(احکام القرآن للامام جصاص الرازی: الجلد الثالث صفحہ ۳۸۶)

اہل علم نے اس کی بدیں طور تاویل کی ہے کہ اہل جاہلیت حوادث و بلایا اور مصائب کو دہر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ دہر نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا اور پھر دہر کو گالی دیا کرتے تھے جیسا کہ بہت سے لوگوں کی یہ کہنے کی عادت ہوا کرتی ہے کہ ہمارے ساتھ دہر نے یہ برائی کی وغیرہ وغیرہ۔ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان امور کے فاعل کو گالی مت دو کیونکہ ان کا فاعل اور پیدا کرنے والا اللہ تبارک تعالیٰ ہی تو ہے۔

یہی نہیں بلکہ دفع دخل مقدر کے طور پر انھوں نے یہ بھی تصریح کردی ہے کہ دہر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے بھی نہیں ہے جیسا کہ بعد کے "متصوفین و حکمائے متاخرین" نے وہم تراشی کی ہے۔ اور یہ صرف امام جصاص الرازی ہی کا قول نہیں ہے بلکہ انھوں نے تو مبہم طور پر صراحت کی ہے کہ ان کی زمانہ (چوتھی صدی ہجری) تک علمائے اسلام میں سے کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں تھا۔

"ولوکان مرفوعا کان الدھر اسما للہ تعالیٰ وکان کذلک لان احدا من المسلمین لایسمی اللہ بھذا الاسم"

اور اگر دہر "مرفوع" ہوتا (پیش ہوتا) تو وہ اسمائے باری میں سے ہوتا مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو اس نام سے موسوم نہیں کرتا۔

البتہ پانچویں صدی ہجری میں اسپین کے مشہور عالم ابن حزم نے دوسری جدت آفرینیوں کے ساتھ یہ جدت بھی فرمائی کہ "دہر" کو باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں محسوب کیا۔ مگر ابن حزم اور ابن حزم کے انداز پر سوچنے والے حکمائے متاخرین اور متصوفین کی یہ جدت آفرینی طبقۂ علماء میں مقبول نہ ہو سکی اور انھوں نے بالاتفاق اس کی تغلیط کر کے اس موقف سے برأت کا اظہار کیا، چنانچہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے :-

"وقد غلط ابن حزم ومن نحا نحوہ ان الدھر من اسماء اللہ تعالیٰ"

ابن حزم اور اُن کے انداز پر سوچنے والوں نے غلطی کی ہے جو انھوں نے "دہر" کو اسماءِ باری میں سے سمجھ لیا۔

رہے متکلمین تو انھوں نے تو زمانہ کے وجود ہی سے انکار کر دیا چنانچہ "شرح المواقف" میں ہے۔

"انہم اعنی المتکلمین .... انکروا ایضاً الزمان"

انھوں نے یعنی متکلمین نے زمانہ کے وجود خارجی کا بھی انکار کیا ہے۔

اور یہ ان کی تنگ نظری نہیں تھی بلکہ دوراندیشی کا نتیجہ تھا کیونکہ زمانہ کا تصور ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے ہی اسے قدیم ماننا پڑتا ہے۔ چنانچہ امام رازی نے "المباحث المشرقیہ" میں ارسطو کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے :-

"قال المعلم الاول : من قال بحدوث الزمان فقد قال بقدمہ من حیث لا یشعر بہ" (المباحث المشرقیہ المجلد الاول صفحہ ۶۵۹)

(معلم اول (ارسطو) نے کہا ہے کہ جو شخص زمانہ کے حدوث کا قائل ہے وہ غیر شعوری طور پر اس کے قدیم ہونے کا بھی معتقد ہو جاتا ہے)

اور یہ چیز اسلام کی بنیادی تعلیم (توحید ربوبیت) کے انکار کے مترادف تھی لہٰذا ان کے لئے زمانہ کے انکار کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

غرض حدیث "لا تسبّوا الدھر" کے الفاظ جو کچھ رہے ہوں اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا، علماء تو درکنار نو آموز طلباء بھی جانتے تھے کہ اس کے معنی ہیں :-

"دہر (زمانہ) کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مقلب دہر (اور حوادث روزگار کا فاعل) ہے"

اور آج بھی جو حضرات اس حدیث کو پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں، یہی معنی سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔

مگر علامہ اقبال نے غیر شعوری تجدد پسندی کے نتیجہ میں اس حدیث کو انتہائی خطرناک الحاد کی بنیاد بنالیا، چنانچہ وہ کہیں اسے "جبار و قہار" بتاتے ہیں اور اس کی زبان سے کہلواتے ہیں :-

چنگیزی و تیموری مشتے زغبار من ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرار من

انسان و جہانِ او از نقش و نگار من خون جگر مرداں سامان بہار من

من آتش سوزانم من روضۂ رضوانم

کہیں اسے "نقش گر حادثات" بتلاتے ہیں:-

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

اور کہیں اسے "اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم" کی طرح "لا تاخذہ سنۃ ولا نوم" کی صفت تنزیہی سے متصف فرماتے ہیں :-

"A deeper insight into our concious experience shows that beneath the appearnce of serial duration is true durati02.............. untouched by weariness and unseizable by slamber or sleep."

مگر علامہ اس فکری بیراہ روی میں بڑی حد تک معذور تھے۔ اسلام کے لئے مر مٹنے کی اُن کی تڑپ مسلّم، مگر اُن کی ذہنی و فکری تشکیل میں جن عوامل نے موثر طور پر حصّہ لیا تھا، وہ تقریباً سب کے سب غیر اسلامی تھے، اسلامی عوامل میں یا اُن کی تڑپ تھی یا "ہندوستان میں علوم اسلام کی جوئے شیر کے فرہاد" کی عقیدت۔ مگر

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

"صدرا" اور "شمس بازغہ" نامعقول سہی اور اس لئے ان کے لئے ناقابل فہم یا ناقابل اعتناء۔ لیکن "بخاری شریف" کی حدیث "لاتسبوالدھر" کے متعلق تو وہ ان کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکتے تھے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ اگر وہ علامہ کو ٹوک دیتے۔

کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

تو یقیناً وہ اس اصرار علی الباطل سے دست بردار ہو جاتے۔

اس کے ساتھ علماء روزگار کی بھی کچھ ذمہ داری تھی۔ آخر تو یہ "تالِّ زمان" "وحدت الوجود" اور "متحدہ قومیت" کے انکار سے کمتر خفیف نہیں تھا۔ اگر تصوف بالخصوص وحدت الوجود کے انکار کی بناء پر آسمان گر پڑ سکتا تھا، اگر "ملّت از وطن است" کے انکار سے ملّت میں زلزلہ آسکتا تھا تو کیا۔

" A critical interpretation of the sequence of time as revealed in ourselves, has led us to a notion of the Ultimate Reality as pure duration ".

کی تبلیغ و اشاعت سے پورے دینی مشن کی بنیاد کھوکھلی نہیں ہو سکتی ہے۔

(باقی)